تعارف

شریف منوّر



تعارف

شریف منوّر

کارواں پبلیکیشنز

۱۲۹-الف مانک جی اسٹریٹ گارڈن ایسٹ

کراچی-۳ فون: (۷۰۵۵۶)

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

MASOOD FAISAL JHANDIR LIBRARY
Acc 092029
MAILSI

بار اوّل: اکتوبر ۱۹۷۸ء

کتابت: محمد اختر

سرورق: لیاقت حسین

مطبع: عبّاسی پریس کراچی

تعداد: ایک ہزار

قیمت: دس روپے

DIGITAL SUPPORT BY
CHUGHTAI
PUBLIC LIBRARY
Masood Faisal Jhandir Library

بنامِ شاہدِ نازک خیالاں

گوشۂ ڈاکٹر عرش صدیقی
Masood Faisal Jhandir Library

MASOOD FAISAL JHANDIR LIBRARY
Acc No: 092029
★ MAILSI ★

TECHNICAL SUPPORT BY
CHUGHTAI
PUBLIC LIBRARY

محرمِ غنچہ ہوں مری جاں پر
رنگ و بو کے عذاب ہیں کیا کیا

Masood Faisal Jhandir Library

ترتیب

حرفِ اوّل

احساس کی صورت گری ایک دشوار عمل ہے لیکن ذکر بھی اپنا ہو اور بیان بھی اپنا تو یہ عمل دشوار ہی نہیں ناخوش گوار بھی ہے۔ ہر چند کہ اس میں کسی رازداں کے رقیب ہونے کا بظاہر کوئی امکان نہیں۔

مجھے نہیں معلوم کہ میں نے شعر کیوں کہنے شروع کیے۔ ممکن ہے اس کی وجہ وہ ماحول ہو جس میں میں نے آنکھ کھولی۔ یا شاید کئی سو سالہ آبائی روایات کے اثرات ہوں جن میں شعر و ادب اور سماع کو بنیادی ضرورت سمجھا جاتا تھا۔

مجھے اتنا احساس ضرور ہے کہ میری ابتدائی شاعری کسی ذاتی واردات اور اندرونی لہر ہی کی رہینِ منّت تھی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ حسبِ استطاعت بڑھتے ہوئے مطالعے، مشاہدے اور تبدیل ہوتے ہوئے ماحول نے زندگی کو لمحہ بہ لمحہ نت نئی حیرتوں سے روشناس کیا۔ یہی حیرتیں بساط بھر حسّی اور جمالیاتی تجربے کی شکل میں آپ کے سامنے ہیں۔

شاعری میرے نزدیک فقط میکانکی عمل کا نام نہیں۔ یہ شوقِ فضول یا غیرِ شعوری اظہار بھی نہیں۔ شاعر معاشرے کے حسّاس ترین افراد میں سے ہوتا ہے لہٰذا زندگی کے مسائل و مطالبات اور عصری تقاضوں کو دوسروں سے کہیں زیادہ شدّت سے محسوس کرتا ہے۔ وہ زندگی اور کائنات میں حسن و جمال کی جستجو کرتا ہے لیکن انہیں حسین تر دیکھنے کا آرزومند بھی ہوتا ہے۔ یہ آرزومندی، احساس میں رچ بس کر جب لبوں کو متحرک کرتی ہے تو وہ آواز پیدا ہوتی ہے جو زندگی اور کائنات میں رشتہ قائم کرتی ہے۔

شاعری میں میرا نقطۂ نظر یہی آرزومندی ہے۔

میں نے نظم بھی لکھی ہے اور نثر بھی۔ نظم میں میرے لئے اظہار کا سب سے بہتر سانچہ غزل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مجموعہ صرف غزلیات ہی پر مشتمل ہے جو ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۸ء تک لکھی گئیں میں نے اس مجموعے میں اب تک کی ذہنی اور جذباتی مسافتوں کے دھندلے اور واضح نقوش یکجا کر دیئے ہیں تاکہ خیال و فکر کے تسلسل، تبدیلی اور ممکنہ پھیلاؤ کی نشاندہی ہو سکے۔

میری شاعری کی ابتداء ۱۹۵۷ء میں حیدر آباد (سندھ) میں ہوئی۔ پہلے پہل بچوں کی نظمیں لکھیں باقاعدہ شعر گوئی کا آغاز ۱۹۶۰ء میں ہوا۔ ابتدا ہی سے قابلؔ اجمیری مرحوم اور جناب اعجاز احسانی کی قدم قدم حوصلہ افزائی نے اس مشغلے کو جاری رکھنے میں بڑی مدد کی۔ جناب رئیس امروہوی کی بے پایاں شفقت اور ہمت افزائی سے یہ مشغلہ، وظیفہ حیات بن گیا۔

جنوری ۱۹۶۹ء میں ملازمت کے سلسلے میں مستقل کراچی آنا پڑا۔ یہاں برادر محترم جون ایلیا اور برادر عزیز محمد علی صدیقی سے خلوص و محبت کا رشتہ استوار ہوا۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میں نے ہر دو حضرات سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ میں ان کی بے پناہ عنایتوں کا ممنون ہوں۔

اپنے دیرینہ رفقاء راشد مفتی، قمرؔ آرزو، مرغوب اختر اور رزاق طاہرانی کا بھی سپاس گزار ہوں۔ یہ احباب میری وحشتوں کے امین رہے ہیں۔ ان کی ترغیب اور اصرار کے بغیر یہ منتشر تحریریں یکجا ہونی مشکل تھیں۔

آخر میں محترم حسن عابد کا تہ دل سے مشکور ہوں کہ انہوں نے نہ صرف بیاض کا تفصیلی جائزہ لیا بلکہ ہر مرحلے پر اپنے گرانقدر مشوروں سے نوازا۔

شریف منور
۲۴ر اگست ۱۹۷۸ء

۹/۱۶۶۔ فیڈرل بی ایریا
کراچی نمبر ۳۸

○

بس یہ سوچ کر، ہم نے طبع آزمائی کی
نغمگی امانت ہے گوشِ آشنائی کی

ایک ہی روایت ہے تجربے کی ہر تہہ میں
تیری خود نمائی کی اپنی خود ستائی کی

نطق و لب پہ گذرے ہیں کتنے سانحے لیکن
داستاں ادھوری ہے ذوقِ خوش نوائی کی

منزلوں سے محرومی شاعری میں ڈھلتی ہے
داد چاہتے ہو کیا تم شکستہ پائی کی

دن کا ایک اک لمحہ رینگتا ہوا گذرا
اور ابھی تو باقی ہے رات بھی جُدائی کی

کب ذریعۂ عزت شاعری رہی تاہم
زندگی میں لے دے کے اِک یہی کمائی کی

۱۹۷۴ء

○

دیدہ و دل میں اُتر جاتا ہے!!
ہر عذاب آ کے ٹھہر جاتا ہے!!

کوئی جی اٹھتا ہے مجھ میں ہر روز
روز مجھ میں کوئی مر جاتا ہے

یہ ملاقات ہے چوراہے کی
دیکھئے کون کدھر جاتا ہے

فکر گھر کی ہو تو وحشت چھوٹے
کارِ وحشت ہو تو گھر جاتا ہے

رات کس طرح مری جاں گذرے
دن تو دفتر میں گذر جاتا ہے

یہ جو طوفان ہے اس کا سہرا
ایک ہی موج کے سر جاتا ہے

یہ جنوں کیا ہے منوّر تجھ کو!!
کیوں سرِ شام ہی گھر جاتا ہے

۱۹۷۵ء

سینے میں چھپائے گا بھی غنچہ تو کہاں تک
جھونکا کوئی خوشبو کو سفر دے کے رہے گا

سورج کی تمازت میں کمی آئے نہ آئے
جو چھاؤں کہ دینی ہے شجر دے کے رہے گا

○

بے مقصد خاکے، مبہم تصویریں ہیں
کاغذ پر کچھ نامعلوم لکیریں ہیں

اک دریا میں اٹھتی ہیں لاکھوں موجیں
اک انساں ہے اور کتنی تصویریں ہیں

اچھا چہرہ اکثر دھوکا دیتا ہے
عمدہ کاغذ پر گھٹیا تحریریں ہیں

ان کی نظمیں خوب، مرے اشعار فضول
خواب ہیں یکساں الگ الگ تعبیریں ہیں

عہدِ حاضر کا وحشی ہوں میرے لئے
نئی پرانی کتنی ہی زنجیریں ہیں

۱۹۷۵ء

○

ایک اک حرف اُجالا دے گا
شعر خود اپنا حوالا دے گا

اجرِ شورش تجھے اے موجۂ تیز
کوئی گرداب کا پالا دے گا

نوکِ ہر خار کی تیزی کا جواب
پاؤں احساس کا چھالا دے گا

تیری تصویر کو اک رنگ نیا
اب تو مکڑی کا یہ جالا دے گا

جانے کس دل کو کرے گا تاریک
جانے کس گھر کو اُجالا دے گا

فن اگر فن ہے تو پھر ذرّے کو
ایک دن قد ہمالا دے گا

۱۹۷۵ء

رقمِ صحیفۂ عہدِ عذاب کرنا ہے
مزید یہ کہ کڑا انتخاب کرنا ہے

یہ نطق و لب کا تقاضا کہ بولنا ہے ضرور
مگر خبر نہیں کس سے خطاب کرنا ہے

میں اپنا رنگ سمجھتا ہوں، روپ جانتا ہوں
مجھے تو آپ ہر اک احتساب کرنا ہے

نظر میں موسمِ امروز بھی ہے فردا بھی
گئی رتوں کا بھی مجھ کو حساب کرنا ہے

ہر ایک زخم سہا ہے اس اعتماد کے ساتھ
ہر ایک زخم کو رشکِ گلاب کرنا ہے

بری بھلی شبِ ہجراں تو کاٹ دی ہم نے
اب اس کی یاد میں دن بھی خراب کرنا ہے

۱۹۷۴ء

فضا باہر سے اندر کی جدا ہے
ہر اک ہنگامہ حسرت ناک سا ہے

نجانے کونسی صورت ابھر آئے
مصوّر تو لکیریں کھینچتا ہے

بسے ہیں گھر میں ہنگامے ہزاروں
مرے کمرے میں اک آسیب سا ہے

نہیں کچھ سوچنے کی دل کو فرصت
مگر سوچے تو بہتروں سوچتا ہے

یکایک جانے کس کی یاد آئی!!!
قلم چلتے ہوئے رکنے لگا ہے

کٹی ہے عمر اندازوں پہ اپنی
بہت دن بعد اندازہ ہوا ہے

کہاں جاؤں میں آوازوں سے بچ کے
وہ سناٹا ہے، کمرہ گونجتا ہے

مرے ہمسائے اکثر سوچتے ہیں
منوّر رات بھر کیوں جاگتا ہے

۱۹۷۶ء

تم میں مجھ میں فرق ہے کچھ تو بس اتنا
تم جو کہو گے کل میں آج وہ کہتا ہوں

○

اپنے دفتر سے نکلتے ہیں تو گھر جاتے ہیں
لوگ جینے کی تگ و دَو میں بھی مر جاتے ہیں

رات بھر ہوتے ہیں کس طرح نجانے یکجا!!
صبحدم شہر کی سڑکوں پہ بکھر جاتے ہیں!

شاخِ گُل کتنی ہی فصلوں کے اٹھاتی ہے عذاب
رنگ و بو پھول میں یونہی نہیں بھر جاتے ہیں

حادثے رہتے ہیں یوں عمرِ رواں کے ہمراہ
جیسے امواج کے ہمراہ بھنور جاتے ہیں

اجنبی شہر میں شاید کوئی اپنا مل جائے
جس جگہ بھیڑ نظر آئے ٹھہر جاتے ہیں!

جب بھی مر جاتا ہے مفلس، کسی کنبے کا کفیل
ایک کے ساتھ کئی اور بھی مر جاتے ہیں

مجھ کو معلوم ہے جب میں نہیں ہوتا موجود
خود بخود آپ کے گیسو بھی سنور جاتے ہیں

۱۹۷۶ء

اس سے پہلے تو کبھی تھی نہ یہ شہرت میری
سنگِ طفلاں بھی ہوئی ایک ضرورت میری

لاابالی سا ہوں گم صم سا ہوں بے پروا سا
راس کس طرح تمہیں آئے گی قربت میری

○

ہر بدلتے ہوئے منظر میں رہو
نئی الجھن، نئے چکر میں رہو

رابطہ گھر سے رہے باہر کا
کسی روزن کی طرح گھر میں رہو

رات بھر سیر کرو دُنیا کی
رات بھر اپنے ہی بستر میں رہو

حادثو! دل میں بسا لوں تم کو
سانحو! آؤ مرے گھر میں رہو

ہر نفَس دفترِ احساس لکھو
ہر گھڑی عرصۂ محشر میں رہو

حسن سڑکوں کا تماشا ٹھہرا
دوستو! دیدہ درو! گھر میں رہو

کیا قیامت ہے کہ تم غیر کے ساتھ
میرے ہی گھر کے برابر میں رہو

گھر کے ہنگاموں سے فرصت پا کر
بام پر آؤ کبھی در میں رہو!

۱۹۷۶ء

دھوپ آتی ہے دریچوں سے ابھی
کبھی ممکن ہے ہوا بھی آئے!!

○

اذیتِ دل مشکیں نفس بڑھاؤ مت
جو درد دل میں چھپا ہے اسے چھپاؤ مت

وہ خود پسند بہت اور تم بہت خود دار
یہ شعر لکھے ہیں جس پر اسے سناؤ مت

تمہارے روزن و در روشنی کی سمت نہیں
سحر کے بعد بھی گھر کے دیئے بجھاؤ مت

اب اس سے بڑھ کے حماقت بھی اور کیا ہوگی
کہ جس کو یاد نہ آؤ اسے بھلاؤ مت

ہوا نے برگِ شکستہ سے کہہ دیا آخر!
تم اس زمین پہ اپنے قدم جماؤ مت

وہی ہے وحشتِ دل اور وہی عذابِ نظر
ابھی شریف منوّر کے پاس آؤ مت

۱۹۷۳ء

(۱)

دیدۂ بیدار کا کیا اعتبار
ایک صورت اور آئینے ہزار

عرصۂ محدود و روداد طویل!
کوئے جاناں اور یہ لمبی قطار

عالمِ محسوس کی بھی بات کر
آنکھ کو اندھے کنوئیں میں مت اتار

دیکھتے رہئے ہوا کی دل لگی
چند لمحوں تک ہے یہ گرد و غبار

کر دعائے خیر دشمن کے لئے
اپنا خنجر اپنے سینے میں اتار

خامشی بھی وجہِ شہرت ہو گئی
لگ گئے دیوار و در پر اشتہار

۱۹۷۵ء

○

بلا سے طائرِ وحشی کی وہ اُڑان نہ ہو
زمیں ہو پاؤں تلے، قریبِ آسمان نہ ہو

عذابِ رفتہ و اندیشہ ہائے آئندہ
ہماری طرح کوئی اور نوجوان نہ ہو

بلندیوں کے مکیں کب زمین پر آئیں
بلندیوں کے عقب میں اگر ڈھلان نہ ہو

رہا ہے گھر سے زیادہ خیال صحرا کا
ہماری طرح کوئی ننگِ خاندان نہ ہو

بسے ہوئے ہیں ان آنکھوں میں رت جگے ایسے
کہ ایک شب کئی راتوں میں بھی بیان نہ ہو

وہ آدمی بھی کراچی میں آدمی کب ہے
کہ جس کے پاس سواری نہ ہو، مکان نہ ہو

۱۹۷۶ء

○

یہ کیا کہ پردۂ الفاظ میں چھپائے مجھے
ہر ایک شعر مرا سامنے بھی لائے مجھے

مرا بدن ہی تمازت پسند ہے ورنہ
ہزار راہ میں ملتے رہے ہیں سائے مجھے

میں باوفا تھا مگر اُس سے بے وفائی کی
کہ اس سلوک سے شاید وہ بھول جائے مجھے

وہ ابتدائے محبّت کی شاعری میری
پڑھوں تو خود پہ ترس بھی ہنسی بھی آئے مجھے

گذر رہا ہے یہ کس مرحلے سے فن میرا
جو نقش خود میں بناؤں وہی ڈرائے مجھے

۱۹۶۶ء

○

چاہنے پر بھی نہ چاہا ہم کو
اُس نے ہم سے بھی چھپایا ہم کو

جس نے مضمون لکھے تھے ہم پر
اس نے پھر خط بھی نہ لکھا ہم کو

جو مسرّت ملی، تقسیم ہوئی
اور ملا درد سو تنہا ہم کو

حادثوں ہی نے چڑھایا پروان
غم ملے حوصلہ افزا ہم کو

ہم کہ دُنیا کے لئے روئے ہیں
دیکھنا روئے گی دنیا ہم کو

۱۹۷۰ء

○

یہ حُسن، یہ خلوص، یہ چاہت نہ آئی تھی
جب اپنے درمیان ضرورت نہ آئی تھی!

کالر پہ اپنے اس کو سجائے پھرے ہیں ہم
وہ گُل کہ جس سے بوئے محبت نہ آئی تھی

اک سانحہ تھا ہجر مگر اس سے بیشتر
تجھ میں خلوص، مجھ میں صداقت نہ آئی تھی

مجموعۂ خیال میں کتنے ہی رنگ تھے
جب تک بیان پر ہمیں قدرت نہ آئی تھی

اک گوہرِ خیال تھا سو نذرِ فن ہوا
اور اپنے ہاتھ میں کوئی دولت نہ آئی تھی

جانِ جہاں مجھے تری قربت پہ ناز تھا
لہجوں میں جب تلک یہ مروّت نہ آئی تھی

۱۹۷۳ء

○

①

ہر نفس بن گیا وبال میاں
اب تو خود کو ذرا سنبھال میاں

اس کی ہر اک ادا ہے تہہ در تہہ
دل سے خوش فہمیاں نکال میاں

جس طرح پچھلے دس برس گذرے
اور گذریں گے چند سال میاں

دل میں رہ رہ کے ٹوٹتا ہے کچھ
آگیا کیا ہمیں خیال میاں

دے منور جواب کس کس کو!!
ہر نظر میں ہے اک سوال میاں

۱۹۷۹ء

○

عیشِ حاضر بھی کہاں غم سے رہائی دے گا
لذتِ قرب میں احساسِ جدائی دے گا

ایک ہی عکس ہر اک عکس پہ ہو گا حاوی
لاکھ چہروں میں وہی شخص دکھائی دے گا

اُف یہ اخلاص ترا، اف یہ ترا طرزِ تپاک
تو مجھے کون سا دکھ اے مرے بھائی دے گا

ہائے وہ غم کہ ملے گا مجھے شہنائی سے
ہائے وہ دکھ جو ترا دستِ حنائی دے گا

میرے احساس سے ظاہر ہے صداقت میری
میں جو چاہوں گا وہی رنگ دکھائی دے گا

سر پھرا لاکھ سہی پھر بھی منّور کب تک
برفِ احساس کو تو شعلہ قبائی دے گا!

۱۹۷۱ء

○

بہت دلکش وفا کی رہگذر ہے
مگر یا رویہ جذباتی سفر ہے

رہے تازہ سدا زخمِ تمنّا!!
یہی سرمایۂ اہلِ ہنر ہے

جنوں بھی ہو نہ کیوں محتاط آخر!
کہ وہ نازک ادا اب ہمسفر ہے

کسی کا سوگ ہو لکھوں میں نوحہ
ہر اک ماتم کدہ میرا ہی گھر ہے

کُجا منزل کہ ہیں راہیں گریزاں
عجب انداز کا اپنا سفر ہے

رہے محفوظ تو اے شمعِ خلوت
منوّر تو چراغِ رہگذر ہے

۶۱۹۶۳

○

بدل بدل کے وہی صورتیں دکھائے کہیں
یہ عہدِ نو بھی پرانے ہی دُکھ نہ لائے کہیں

پھر اس کے حُسن کی رنگت نہ ہو بہاروں میں
پھر اس کی زلف کی خوشبو ہوا نہ لائے کہیں

نگاہ رُک گئی کس پر کہ پھر ہٹی ہی نہیں
قدم اُکھڑ گئے ایسے کہ جم نہ پائے کہیں!!

بہت ہے رندِ خرابات آج کل ہشیار
کہ مے پیئے یہ کہیں اور لڑکھڑائے کہیں!

یہ آرزو بھی کہ چلاؤں پوری قوت سے
یہ خوف بھی کہ صدا کوئی سن نہ پائے کہیں

عجیب کھیل منوّر یہ ہم نے دیکھا ہے
کہیں ہے دھوپ فقط اور صرف سائے کہیں

۶۱۹۶۷

○

کچھ تو احساسِ زار حالی ہے
کچھ طبیعت بھی لا اُبالی ہے

اس کو دیکھا تو یہ گماں ہوا!
یہ حسینہ تو خواب والی ہے

کل تھی کیا کیا امیدِ برگ و ثمر
آج بوجھل ہر ایک ڈالی ہے

کچھ تو گھر بھی تباہ کر آئے
کچھ نئے دنیا نئی بسا لی ہے

گمرہی ہے بجا مگر ہم نے
اک نئی راہ تو نکالی ہے!!

۱۹۶۶ء

○

جنونِ شوق میں اپنی گرہ سے کیا نہ گیا
یہ اور بات کہ اب تک وہ حوصلا نہ گیا

غبارِ راہ تھے برسا جونہی سحابِ کرم
کچھ ایسے بیٹھ گئے ہم کہ پھر اٹھا نہ گیا

یہ حادثہ ہے کہ افسانۂ غمِ ہستی!
کہیں کہا نہ گیا اور کہیں سُنا نہ گیا

کہاں کہاں اُسے دیکھوں کہاں کہاں جاؤں
تلاش کو وہ کوئی دائرہ بنا نہ گیا

کہاں کہاں نہ اندھیروں نے راستا روکا
مگر یہ شوق کہاں مشعلیں جلا نہ گیا

نہ ہو سکے مری راہوں میں فاصلے حائل
جہاں میں خود نہ گیا تھا مرا فسانہ گیا

۱۹۶۷ء

○

سب اہلِ غم ہیں درد مجھے بے نظیر دے
اس دستِ نامراد کو یکتا لکیر دے

ساری مصیبتوں کا مجھی پر نزول کر!!!
اس شہر کو نہ پھر کوئی مجھ سا فقیر دے

تیشے کا جس نے نام بھی اب تک سنا نہیں
تیرا کمال ہے کہ اسے جوئے شیر دے

میری حماقتوں کا اڑاتا ہے جو مذاق
کچھ دیر کے لئے اسے میرا ضمیر دے

خوش پوشیوں کے ساتھ نہیں سہل کارِ عشق
مل جائے قیس تو اسے میری نظیر دے

اظہارِ کرب کا کوئی انداز خاص ہو!!!
غالبؔ کا رنگ دے نہ مجھے طرزِ میرؔ دے

۱۹۷۶ء

○

سرِ صحرا کوئی پودا کھڑا ہے
یہ اپنی عمر سے کتنا بڑا ہے

شبِ تاریک و طوفانِ بلا خیز
یہ کومل ہاتھ اور کچّا گھڑا ہے

مسائل سے گریزاں تھا کبھی دل
کبھی بیکار باتوں پر لڑا ہے

تلاشِ سنگ میں قائم ہے اب تک
جو ہیرا تاج میں تیرے گڑا ہے

طبیعت میں ہے جس کی صلح جوئی
وہ اپنے آپ سے اکثر لڑا ہے

منوّر تیرگی سے روشنی تک
سفر کیا جانیے کتنا کڑا ہے

۱۹۷۰ء

○

عکسِ یار ہزار ہوا، دل اتنا پہلو دار ہوا
پہلے پیار تھا ایک تجھی سے اب ہر اک سے پیار ہوا

صبح و شام کا رنگ ہے کوئی اور نہ خوشبو موسم کی
گھر کی نئی تعمیر ہوئی تو جو در تھا دیوار ہوا

کوہ کے لب پر صرف دھواں تھا اب اک آگ بھی روشن ہے
جتنا کوئی خوابیدہ تھا اتنا ہی بیدار ہوا

یاروں کو بس ذمہ داری کے احساس نے مار دیا
ورنہ کارِ شوق تو کب تھا سہل کہ اب دشوار ہوا

اپنے اندر سے باہر تک اک آواز کا رشتہ تھا
اور آواز کا یہ رشتہ ہی شعر بنا، معیار ہوا

کچی عمر کا گھاؤ منور ہرا ہمیشہ رہتا ہے
اب بھی ہے وہ ہجر کا موسم جیسے پہلی بار ہوا

نومبر، ۱۹۷۷ء

○

نغمگی سے سکوت بہتر تھا!!
میں تھا اور اک کراہنے کا گھر تھا

کوئی مجھ سا نہ دوسرا آیا
یوں تو ہر شخص مجھ سے بہتر تھا

ہر طرف قحطِ آب تھا لیکن
ایک طوفان میرے اندر تھا

میں بنا تھا خلیفۂ دوراں
یوں کہ کانٹوں کا تاج سر پر تھا

میں مسلسل وہاں چلا کہ جہاں
دو قدم کا سفر بھی دوبھر تھا

گھِر گیا تھا میں اک جزیرے میں
اور چاروں طرف سمندر تھا

ایک اک موج مجھ سے ٹکرائی
جرم یہ تھا کہ میں شناور تھا

وحشتوں میں بلا کا تھا پھیلاؤ
دشت اور گھر کا ایک منظر تھا

ایک دیوار درمیان رہی
ورنہ دونوں کا ایک ہی گھر تھا

دوست دشمن سبھی کو ہے معلوم
کیا منوّر ہے، کیا منوّر تھا!

۱۹۶۹ء

قرضِ تنہائی کچھ ایسا ہے منوّر سر پر
چونک اٹھتا ہوں میں دستک ہو کسی کے در پر

○

ذرا سی دیر سہی رُخ بدلنا چاہتا ہے
جسے بھی دیکھئے گھر سے نکلنا چاہتا ہے

مرا مزاج سمجھنے کی بھی کرے زحمت
وہ ایک شخص کہ مجھ کو بدلنا چاہتا ہے

لرز رہی ہے یہاں لَو چراغِ خانہ کی!
بتاؤ کون سرِ راہ جلنا چاہتا ہے

اک اضطراب ہے دل سے دریچۂ جاں تک
یہ کون مجھ میں چھپا ہے نکلنا چاہتا ہے

نئے سفر پہ کیا جس نے مجھ کو آمادہ!!
وہی تو اب مرا رستا بدلنا چاہتا ہے

بلا سے تاج میں چمکے کہ خاک میں مل جائے
گہر تو بطنِ صدف سے نکلنا چاہتا ہے

خوشی تو یہ ہے کہ چلنا سکھا رہا ہوں اسے
جو شخص مجھ سے بھی آگے نکلنا چاہتا ہے

۱۹۷۴ء

تھی حقیقت کہ خواب تھا کوئی
آدمی لاجواب تھا کوئی

تشنگی کو عزیز تھا یارو!
آب تھا یا سراب تھا کوئی

صلۂ کاہشِ ہنر دیکھا
ہر برائی نے میرا گھر دیکھا!

کبھی شاعر، کبھی کلرک بنے
روپ کیا کیا نہ دھار کر دیکھا

دشمنوں نے بھی اعتراف کیا
ایسا سودا نہ ایسا سر دیکھا

زندگی اک عجب حقیقت ہے
خود کو سو طرح مار کر دیکھا

پھر نہ اس نے ہی دی صدا ہم کو
اور نہ ہم نے ہی لوٹ کر دیکھا

ظرفِ احساس ہو کہ پاسِ وفا
کم نصیبوں میں بیشتر دیکھا

اپنے اپنے حصار میں تھے لوگ
اہلِ دل کو بھی کم نظر دیکھا

۱۹۶۸ء

ہم میں اور ان میں سلسلہ ہی کیا
رشتۂ گرد و باد تھا ہی کیا

اتنا لکھنے پہ بھی خیال یہ ہے
جیسے ہم نے ابھی لکھا ہی کیا!

○

اپنے احساس کی مالا ہے پرونا مجھ کو
پھول دیتے ہو تو کانٹے بھی چبھونا مجھ کو

خواب ان جاگتی آنکھوں نے کچھ ایسے دیکھے
راس اب جاگنا آئے ہے نہ سونا مجھ کو

ایک تو کرب کی یہ ڈور بڑی لمبی ہے
پھر اسی ڈور میں موتی بھی پرونا مجھ کو

جتنا حساس ہوں اتنا ہی رکھے گردش میں
کوزہ گر خوب بنایا ہے کھلونا مجھ کو

کہیں گہرائی نہ دریا کی بھرم کھو بیٹھے!
سنگ سے باندھ کے دریا میں ڈبونا مجھ کو

یہ جو اجلا سا ہے ملبوس بدن پر میرے
یہی ہر روز پہننا یہی دھوتا مجھ کو!!

۶۱۹۷۳

○

۱

خود تحیّر میں ڈوب جاؤں میں
نقش ایسا کوئی بناؤں میں

رہروی بن گئی ہے مجبوری
تھک بھی جاؤں تو رک نہ پاؤں میں

کیا عجب ہے بہ فیضِ کارِ جنوں
کارِ دنیا بھی سیکھ جاؤں میں

کیوں پکاروں اسے سرِ منزل
راستے میں جسے نہ پاؤں میں

اپنے شعروں میں اس کی تصویریں
وہ ملے تو اسے دکھاؤں میں

۱۹۶۷ء

○

نہ اس کا گھر وہ عمارت نہ ہیں مکینوں میں
ہمارا ساتھ رہا تھوڑی دور زینوں میں

یہ تیز و تند ہوا یہ مہیب سنّاٹا
اداسیاں ہیں مکانوں میں یا مکینوں میں

ضیا ضیا ہیں در و بام، نور نور ہے صحن
اتر رہا ہے مرا چاند گھر کے زینوں میں

ہر اک نظارے کے پیچھے تھے اور نظّارے
حسین بات نہ پائی کوئی حسینوں میں

ہر ایک لمحۂ فرقت بیاں کروں کیسے
کہ چند شعر کہے ہیں کئی مہینوں میں!

سمندروں پہ تنوّر وہ طنز کرتے ہیں
کنارِ آب بھی بیٹھے ہیں جو سفینوں میں

۶۱۹۷۳

○

ریت پر تم نہ سمندر پھینکو
چند قطرے تو نہ جل کر پھینکو

ٹوٹ جائے گا یہ صدیوں کا سکوت
ٹھیرے پانی میں نہ کنکر پھینکو

پھول ہی کیا بہ طریقِ سوغات
میری جانب کوئی پتھر پھینکو

توڑ ڈالو یہ بناوٹ کا حصار
روح کو جسم سے باہر پھینکو

مر چکا بسملِ احساسِ وفا
اب تو ہاتھوں سے یہ خنجر پھینکو

آئینہ خانے کی تکمیل یہ ہے
خوب سج جائے تو پتھر پھینکو

۱۹۶۳ء

○

○

شاید کہ سرِ دیدۂ تر لہر نئی ہے
دریا تو پرانا ہے مگر لہر نئی ہے

ٹھہرے ہوئے پانی پہ بھی چلتی ہیں ہوائیں
خوش فہم سمجھتا ہے کہ ہر لہر نئی ہے

سب کو تو ضرورت ہے نہ فرصت ہے کہ سوچیں
دو چار ہیں جن کو ہے خبر لہر نئی ہے

ان بند مکانوں کے دریچوں کو تو کھولو
دیکھو کہ سرِ راہگذر لہر نئی ہے

بہتر ہے گھٹا لیجئے ساحل کی حدوں کو
ممکن ہی نہیں اس سے مفر لہر نئی ہے

فروری ۷۷ء

○

یہ شاخِ سبز جو پیلی ہوئی ہے!
ہر اک موسم میں تبدیلی ہوئی ہے

ہوئی ہے شخصیت بے آب اپنی
فقط پوشاک بھڑکیلی ہوئی ہے

کیا جب بھی نظر انداز غم کو
گرفتِ غم بہت ڈھیلی ہوئی ہے

لگی ہے آگ جب بھی جھونپڑی میں
تو دشمن ایک اک تیلی ہوئی ہے

ہر اک آزاد ہے پابند مگر کچھ
گھٹاؤں میں ہوا سیلی ہوئی ہے

برہنہ پا چلا جب سے منوّر
تو اک اک چیز نوکیلی ہوئی ہے

۱۹۷۶ء

○

بسا اوقات خود سے پوچھتا ہوں
میں کیا تھا اور اب کیا ہو گیا ہوں

وہ غنچہ ہوں کہ یکتائی کے باوصف
اکیلی شاخ پر مرجھا رہا ہوں

چراغِ رہگذر ہوں اور سرِ شام
ہواؤں کی نظر میں آ گیا ہوں!

مرے احساس کی کیا پوچھتے ہو!
میں اپنے آپ پر ہنستا رہا ہوں

سبھی نے کچھ نہ کچھ مانگا مگر میں
ہمیشہ سوچتا ہی رہ گیا ہوں

اسے ہے گر خیالِ پائے نازک
تو میں کیوں خاکِ صحرا چھانتا ہوں

اجازت ہو تو سستالوں ذرا دیر
بگولہ ہوں، ہوا سے پوچھتا ہوں

مری آنکھیں ہیں چشمِ دورِ حاضر
میں جو کچھ دیکھتا ہوں، لکھ رہا ہوں

اذیّت کوشیٔ دل کچھ نہ پوچھو!!
تباہی پر بھی اپنی ہنس رہا ہوں

مجھے ڈھونڈو نہ اب میرے رفیقو!
میں اپنے آپ سے بچھڑا ہوا ہوں

بڑھی احساس کی لَو جب منوّر
تو اپنے سائے سے اکثر ڈرا ہوں

۱۹۶۴ء

○

اپنا احساس ہے آذر اپنا
خود تراشا ہے یہ پیکر اپنا

یہ ہے وسعت نظری کا انجام
اپنا گھر بھی نہ رہا گھر اپنا

جاں سنبھلتی نہیں فکر و فن سے
وقت کٹتا نہیں لکھ کر اپنا

سب پئیں گے تو پیونگا میں بھی
لائیے توڑ دوں ساغر اپنا

کل تھے گمنام ہم اپنے گھر میں
آج چرچا ہوا گھر گھر اپنا

نام اس کا بھی ہو معماروں میں
جو لئے پھرتا ہے پتھّر اپنا

آج فرصت ہے تو مل لو ورنہ
کل وہی ہم وہی دفتر اپنا!!

۱۹۷۴ء

نیند کی فضائیں ہیں، یاد کی گھٹائیں ہیں
نیم وا دریچوں میں نرم رو ہوائیں ہیں

اُٹھ گیا ہے دنیا سے ذوق ہی سماعت کا
اب مرے تعاقب میں خود مری صدائیں ہیں

○

خامہ فرسائی میں لطفِ آبلہ پائی رہے
گھر میں بھی بیٹھے رہیں اور دشت پیمائی رہے

میرے مخلص دوست کو میری وفا سے ہو گریز
میری ہی دستار کا دشمن مرا بھائی رہے

ہو نہ کربِ ذات تو اظہارِ فن سے فائدہ
جو نہ گہرائی میں جھانکے کیوں وہ بینائی رہے

دیکھ لینا شاعری، پیغمبری ہو جائے گی
ہاں مگر کچھ اور دن یہ وجہِ رسوائی رہے

دیدۂ بینا منوّر اک تماشا ہو گیا
دیکھئے کب تک اسے بھی فخرِ بینائی رہے

۱۹۷۲ء

○

دردِ دل معتبر بھی ہوتا ہے
شخصیت کا اثر بھی ہوتا ہے

کس نگر میں قیام کرتا ہیں!
کہیں مجنوں کا گھر بھی ہوتا ہے

شہر میں آ کے یہ ہوا معلوم
آدمی، جانور بھی ہوتا ہے

ایک بے خوف جستجو کے ساتھ
ایک انجان ڈر بھی ہوتا ہے

شکوۂ دہر کیا کہ دکھ اکثر!!
اپنے احساس پر بھی ہوتا ہے

کوچہ گردو! تمہیں پتا ہے کیا
ایک ذہنی سفر بھی ہوتا ہے

جو بہار و خزاں کے غم سہہ جائے
وہی پودا شجر بھی ہوتا ہے

فن سے اظہارِ فن ہے مشکل تر
دردِ دل دردِ سر بھی ہوتا ہے

۱۹۷۶ء

نکل چکے ہیں جو کانٹے نہ ذکر کر ان کا!!
چبھے ہوئے مرے پاؤں میں خار اور بھی ہیں

○

آب و ہوا تو آ نہ سکی اختیار میں
کاغذ کے پھول ہم نے سجائے بہار میں

گہرائیوں سے دل کی ابھرتا ہے حرف حرف
تفصیل کم نہیں ہے مرے اختصار میں

احساس کیا دلائیں ہم اپنے وجود کا
ہم سے نجانے کتنے لگے ہیں قطار میں

ہم کر رہے ہیں تلخ حقیقت کا سامنا
یہ جانتے ہوئے کہ سکوں ہے فرار میں

یہ اور بات ہے کہ یہ صدمہ بھی سہہ گئے
ورنہ تو دکھ بلا کا ہوا اپنی ہار میں

۱۹۶۱ء

○

محوِ تکرارِ سود و زیاں ہیں
اک شجر کی کئی ٹہنیاں ہیں

شمع شب بھر جلائی، بجھائی
فرش پر جا بجا تیلیاں ہیں

چند تنکوں کی اپنی طلب تھی
اب چمن در چمن بجلیاں ہیں

کھل رہے ہیں بھرم چاہتوں کے
قربتوں میں سوا دوریاں ہیں

شب کے ہاتھوں میں اب تک منوّر
دامنِ صبح کی دھجیاں ہیں

۱۹۷۷ء

○

ہر ادا زیرِ بحث لائی جائے
بات آگے بھی کچھ بڑھائی جائے

اس قدر تیز روشنی ہے کہ بس
چشم سے شکل آشنائی جائے

شاہراہوں سے جو اٹھے تحریک
تنگ گلیوں تلک بھی لائی جائے

اس طرف چاند اس طرف سورج
شمعِ جاں کس طرف جلائی جائے

جولائی ۱۹۷۸ء

حواس میں وہ رہا ہو کہ بد حواس بہت
ہر آدمی کو بدلنے پڑے لباس بہت

تھکن سے چور بدن، دشتِ یاس و تنہائی
اندھیری رات، ندی دور اور پیاس بہت

شراب خانے کا سادہ سا اک اصول یہ ہے
جسے شراب میسّر اسے گلاس بہت

قدم قدم نظر آتے ہیں موت کے سائے
ہمارے دشت سے شہروں میں ہے ہراس بہت

بہر عمل ابھی ردِّ عمل ضروری ہے
سخن شناس کوئی ہو کہ ناشناس بہت

۱۹۷۳ء

○

اے موجِ آب اُٹھ کہ یہ منظر عجیب ہے
ساحل کو ہم نشینیٔ دریا نصیب ہے

درپیش آج اپنی اَنا کا ہے مسئلہ
میرا رفیقِ خاص ہی میرا رقیب ہے

کچھ اہلِ انجمن بھی روایت پسند ہیں
کچھ میری داستاں بھی عجیب و غریب ہے

یہ انتہائے قرب، یہ سرمستیٔ وصال
محسوس ہو رہا ہے جدائی قریب ہے

خوش بخت ہے کہ سب کو تمنائے دوستی
اپنا جو یار ہے وہ بہت بد نصیب ہے

غیروں کے گھر سے بھی اگر آئی صدائے طفل
محسوس یہ ہوا میرا بیٹا نجیب ہے

۱۹۷۵ء

○

حرف اک ایک نیارا لکھیو
جو بھی لکھا ہے دوبارا لکھیو

شبِ ہجرت کا بھی لکھیو احوال
دن بھی جس طرح گذارا لکھیو

اپنی آنکھوں پہ بھروسہ کیجو
کوئی پیارا ہے تو پیارا لکھیو

کسی انسان کا جگر گوشہ ہو
اپنی ہی آنکھ کا تارا لکھیو!!!

میرؔ و غالبؔ کا جو احوال ہوا!
وہی احوال ہمارا لکھیو!!

۱۹۷۶ء

○

کر کے شکایتِ غمِ حالات مت گنوا
برسوں کے بعد کی یہ ملاقات مت گنوا

عرفانِ کائنات بھی اظہارِ ذات ہے
اے بے شعور اپنے مفادات مت گنوا

موقعہ ملا تجھے تو لگا تو بھی قہقہے
ہاتھ آئے ہیں جو سُکھ کے یہ لمحات مت گنوا

دفتر کے بعد بھی وہی دفتر کا تذکرہ
دن تو گنوا دیا ہے مگر رات مت گنوا

موسم کا خاک لطف ہے کمرے میں بیٹھ کر
گھر سے نکل کے دیکھ یہ برسات مت گنوا

۱۹۶۶ء

سارے عالم کے درد مند رہے
ہم بھی کیا انتہا پسند رہے

سرکشی تھی ہماری فطرت میں
پست جتنے ہوئے، بلند رہے

ہوشمندی تو اک ضرورت تھی
فطرتاً ہم جنوں پسند رہے

آبروئے فن کی انکسار سے تھی!
سر جھکایا تو سربلند رہے

ہم زمانے کے درد اپنا کر
اپنے گھر ہی میں ناپسند رہے

بعد تیرے کہ نہ جی لگا لیکن
کونسے کام تھے کہ بند رہے

۶۱۹۷۳

○

دن میں بھی نہ سوئے ہم راتوں میں جاگے ہیں
اے کارِ جنوں تجھ سے بھاگے تھے نہ بھاگے ہیں

کب دیکھئے سی پائیں پیراہنِ ہستی ہم
انگشت شکستہ ہے اُلجھے ہوئے دھاگے ہیں

کیا کیا نہ کیا ہم نے رفتار کی تیزی میں
پھولوں کو بھی روندا ہے کانٹوں پہ بھی بھاگے ہیں

دنیا سہی خوابیدہ لیکن یہی کیا کم ہے
آوازِ جنوں سُن کر کچھ لوگ تو جاگے ہیں

ایسی شبِ ہجراں تو دیکھی نہ سنی اب تک
یہ کیسی اذّیت ہے سوئے ہیں نہ جاگے ہیں

۱۹۷۰ء

○

روز بدلا کریں رُخ ہوائیں تو کیا!
اور بدل جائیں ساری فضائیں تو کیا!

اس قدر بھیڑ ہے، اس قدر شور ہے
ہم نہ ٹھہریں تو کیا، رُک بھی جائیں تو کیا

اب کہ ہر رنگ میں ایک ہی رنگ ہے
یاد رکھیں تو کیا، بھول جائیں تو کیا!!

شعر جس پر لکھے وہ سمجھتا نہیں
ساری دنیا سے ہم داد پائیں تو کیا!

خواب میں بھی ہے، بے خوابیوں کا مزا
ہم منوّر اگر سو بھی جائیں تو کیا!!

۱۹۶۷ء

کچھ حقیقت بھی منوّر کچھ اداکاری رہی
داستانِ شوقِ بے پایاں سدا جاری رہی

اصلیت دیوار و در کی ایک دن چھپ جائے گی
شہر میں اپنے یہی گر رسمِ گُلکاری رہی

چند دن سقراط و افلاطوں سے ہنگامے رہے
قیس اور فرہاد سے بھی کچھ دنوں یاری رہی

اہتمامِ انقلابِ دہر کا عالم نہ پوچھ
گاؤں تو سوتے رہے شہروں میں بیداری رہی

اس قدر آساں نہ تھا اے دوست کارِ عاشقی
عام تیرے شہر میں پھر بھی یہ بیماری رہی

۱۹۶۹ء

○

ترس جاؤ گے خود گھر کے دِیوں کو
خبر مت حبس کی دو آندھیوں کو

شگوفے پھوٹنے سے قبل کچھ دن
نمو کی آگ جُھلسے ڈالیوں کو

نہ ساحل ہے نہ اپنا ہے سمندر
جلایا جب سے ہم نے کشتیوں کو

یہ مانا عافیت کی جا ہے صحرا
ضرورت ہے مری آبادیوں کو!!

بہ ایں عالم مرا ہی فرض ٹھہرا
کہ سمجھوں زیست کی باریکیوں کو

فضا میں پھر رچی بارش کی خوشبو
ابھی پہنے رہو برساتیوں کو

۶۱۹۷۶

○

ہر بُت کو بت شکن بھی سدا رد نہ کر سکا
میں کر رہا ہوں وہ جو مرا جد نہ کر سکا

جتنا ہے کوئی سامنے اتنا اسے نہ جان
سائے کی ہمسری تو کوئی قد نہ کر سکا

دریا بنا تو گھر کے کناروں میں رہ گیا
افسوس کارِ شوق بھی بے حد نہ کر سکا

جوشِ نمو میں مست رہے برگ و بار بھی
کچھ تربیت درخت بھی شاید نہ کر سکا

اندازۂ زوال تھی اونچی اڑان بھی!!
قائم بلندیوں کی کوئی حد نہ کر سکا

لکھنا جو چاہتا تھا منوّر وہ کب لکھا
کرنا جو چاہتا تھا وہ شاید نہ کر سکا

۱۹۷۶ء

○

موتی موتی ٹٹولتے رہئے
ایک اک لفظ تولتے رہئے

بند کیجے کبھی دریچوں کو!
کبھی دروازے کھولتے رہئے

کیوں مِرا انجمن رہے خاموش
اب اکیلے میں بولتے رہئے

شہر کی دلکشی میں کیا شک ہے
جیب کو بھی ٹٹولتے رہئے

بچ گئے ہیں اگر سمندر سے
اپنی لہروں میں ڈولتے رہئے

۱۹۶۹ء

○

آؤ — آنے میں اگر عار نہیں
گھر میں جز سایۂ دیوار نہیں

ہے وہی حوصلۂ رہروِ شوق
ہاں جو پہلے تھی وہ رفتار نہیں!

آگے بڑھنے کی نہیں ہے طاقت
لوٹ جانے کے بھی آثار نہیں

وہ اکیلا نہیں جانے دیتا
ساتھ چلنے پہ بھی تیار نہیں

روز کس طرح ملاقات رہے
میری جاں روز تو اتوار نہیں

عشق ہے مشغلۂ عمرِ طلب
سب مری طرح تو بیکار نہیں

۱۹۶۷ء

○

یہ حقیقت تھی نجانے یا طلسمِ خواب تھا
خشک سالی اک طرف تھی، اک طرف سیلاب تھا

کھو کھلے اجسام سطحِ آب پر تیرا کئے
ورنہ گوہر تو اسیرِ حلقۂ گرداب تھا

اپنی اپنی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے سارے لوگ
کوئی طوفاں میں کوئی ساحل پہ ہی غرقاب تھا

جال دریاؤں کے تھے گو چار سو، پھیلے ہوئے
پھر یہ کیوں ہر شخص مثلِ ماہئ بے آب تھا

تجھ کو اپنانے کا منظر یاد ہے اب تک مجھے
رات تھی، برسات تھی، ہنگامۂ احباب تھا

سنگ وآہن پر بھی اکثر ہم کو آجاتی تھی نیند!
تختۂ دار اپنی خاطر بسترِ کمخواب تھا

ساحلِ فن پر منتور موتیوں کے ڈھیر تھے!!
ہاتھ جو آیا نہیں گوھر وہی نایاب تھا

۱۹۷۲ء

راہوں کے پیچ و خم میں الجھتے چلے گئے
یہ یاد ہی نہیں کہ چلے تھے کہاں سے ہم

○

مقبرہ بن جائے خود معمار کا
کیا بھروسہ ریت کی دیوار کا

کس طرف اٹھّے قدم کس کو غرض
شہر میں چرچا رہا رفتار کا

غمزدہ تو مطمئن سا تھا مگر
کس نے سمجھا غم کسی غمخوار کا

میں ہوں اور ہر ذرّۂ صحرا کا غم
تو ہے اور ماتم در و دیوار کا

رابطہ رکھئے ہر اک فنکار سے
شعر کہئے اپنے ہی معیار کا

اس سمندر میں گھرے ہیں ہم جہاں
کشتیوں پر بوجھ ہے پتوار کا

لہر جب اٹھے صدف ساحل پہ لائے
کوئی موقعہ بھی تو ہو اظہار کا

خامہ بے روشنائی بھی ہوں میں
منتظر بھی ہوں کسی شہکار کا

مہرِ عالمتاب سر پر آ گیا
بجھ گیا سایا ہر اک دیوار کا

کوئی چہرہ ہو کہ ہو کوئی کتاب
سب پہ ہے جادو سمندر پار کا

۱۹۷۶ء

دن سے مطلب ہمیں نہ اب شب سے
تجھ سے بچھڑے، بچھڑ گئے سب سے

○

لفظوں سے میری فکر کا کب حق اَدا ہوا
گرد و غبار سے ہے یہ موتی اَٹا ہوا!

دشتِ وفا میں درد کی پُروائیاں چلیں
دل میں پھر آج زخم کا جنگل ہَرا ہوا

اس نے بھی خوب میری وفا کا دیا جواب
صحرا میں آگیا وہ مجھے دیکھتا ہوا

اک بار آگئے تھے کسی کی نگاہ میں
ایسا شدید پھر نہ کوئی حادثہ ہوا

تجھ کو خبر بھی ہے کہ مرے ساتھ تیرا نام
اب تک ہے بوڑھے پیڑ کے دل میں کھُدا ہوا

۱۹۶۲ء

○

حرفِ غم سے نہ الگ جان مجھے
میرے شعروں ہی سے پہچان مجھے

لکشمی بن کے جو گھر میں آئی!!
کر گئی بے سر و سامان مجھے

سرسری دیکھ نہ اشعار مرے
اتنا آسان بھی مت جان مجھے

میں بلندی کا سفر کیا کرتا!!
رہگذر ہی ملی ڈھلوان مجھے!!

یہ بھی ہونا تھا کہ اپنے گھر میں
وہ سمجھتا رہا مہمان مجھے

شاعری ایک تماشا ٹھہری
سب ملے صاحبِ دیوان مجھے

۱۹۷۵ء

○

زندگی دشتِ بے حدود میں ہے
اک عدم سا مرے وجود میں ہے

شاعری، عاشقی و مے نوشی
ہر خرابی مری نمود میں ہے!

ایک دل میں ہیں تہہ بہ تہہ سو غم
ایک جاں کتنی ہی قیود میں ہے

شہر و صحرا میں ہو رہی ہے تمیز
اب جنوں ہوش کی حدود میں ہے

وہ نہیں ہے جو آ رہا ہے نظر
اک وجود اور ہر وجود میں ہے

۱۹۷۵ء

○

دل بھی دنیا میں گم ہوا ہے کیا
آئینہ سنگ ہو گیا ہے کیا

میں نہ تھا لمحۂ گریزاں تھا
اب یہ مُڑ مُڑ کے دیکھتا ہے کیا

سوچتے سب ہیں پر مری مانند
اور کوئی بھی سوچتا ہے کیا

دیکھ عکسِ رخِ نگار کے ساتھ
آئینہ بھی سنور گیا ہے کیا

رت بدلتے ہی دل بدلتے ہیں
تو مرے شہر میں نیا ہے کیا

نگۂ دیدہ ور ملے تو دیکھ
ایک نقطہ بھی پھیلتا ہے کیا

۱۹۶۶ء

ہر تماشا چند لمحوں میں پرانا ہو گیا
رفتہ رفتہ بند پھر اک دریچہ ہو گیا

جانے کس جانب سے سورج کی کرن مجھ پر پڑی
میرا سایا میرے قامت سے بھی اونچا ہو گیا

آگہی اور عاشقی، دیوانگی اور مے کشی
تجربہ بائیس برسوں میں بہت سا ہو گیا

یہ سزائے شوق ہے یا قیمتِ خود آگہی
دل ہوا پر نور تو بے نور چہرہ ہو گیا

شعر کا فن بھی منوّر اپنے کام آیا نہیں
ہم ہوئے فنکار تو یہ فن ہی رسوا ہو گیا

۶۱۹۶۶

شیشۂ دل دوکان میں آیا
پتھروں کی امان میں آیا!!

ہم تھے صحرا میں تب بمشکل وہ
اپنے کمرے سے لان میں آیا

اُف وہ صدیاں کہ ذہن سے گذریں
اُف وہ لمحہ کہ دھیان میں آیا

مجھ سا احساس اور مجھ سا جنون
کب کسی نوجوان میں آیا!!!

مجھ سا صحرا نورد سودائی
کب ہر اک خاندان میں آیا!

سچ بتا، طبعِ حاشیہ آرا
کیوں یہ وقفہ بیان میں آیا

جانے کیا کیا خیال سے نکلا
جانے کیا کیا گمان میں آیا!!

۱۹۶۵ء

ایک سے دوسرے رستے پہ نکل جاؤں گا
ٹھوکریں کھاؤں گا اتنی کہ سنبھل جاؤں گا

جب تمنّا کوئی بے تاب کرے گی مجھ کو
کسی سائے کے تعاقب میں نکل جاؤں گا

ایسا محسوس کر رہا ہوں میں
جیسے اس شہر میں نیا ہوں میں

اپنی خوشبو سے خوف آتا ہے
کن ہواؤں میں گھر گیا ہوں میں

تیری کچھ اور بات ہے ورنہ
ساتھ اپنے بھی کم رہا ہوں میں

خال و خد پر نہ اپنے غور کرو
مجھ سے روٹھو کہ آئینہ ہوں میں

اُف یہ کیفِ فسانہ ہائے جنوں
لکھ رہا ہوں مٹا رہا ہوں میں

کوئی موسم ہو اب مجھے کیا فکر!
برگ ہوں شاخ سے جدا ہوں میں

ہوں منوّر بڑا تو میں لیکن!
کون جانے کہ کیوں بُرا ہوں میں

۱۹۶۷ء

لفظ معنی سے برہنہ، پھول سے خوشبو جدا
دسترس میں فکر کی کوئی خیال آتا نہیں

قربتیں ایسی کہ مہر و ماہ بھی ہیں ہمسفر!
دوریاں ایسی کہ ہمسایا بھی ہمسایا نہیں

○

اک پھول کھلا کرتا ہے سوزِ غم چھپا کے
شاید کہ تقاضے ہیں یہی آب و ہوا کے

ہر چند بیاباں میں ہر سمت ہے خطرہ
لُٹ جاتے مسافر نہ کہیں شہر میں آکے

خود اپنے ہی احساس سے کھلتا ہے جو غنچہ
احسان اٹھائے بھی تو کیوں بادِ صبا کے

ہے یوں تو مرے دستِ طلب میں ترا دامن
اے دوست مگر فاصلے اب بھی ہیں بلا کے

میں شاخ سے ٹوٹے ہوئے پتّے کی طرح ہوں
کس سمت ہوا دیکھئے لے جائے اڑا کے

لکھّوں بھی تو کس طرح ترے حُسن کی تفسیر
مفہوم کئی ہیں تری اک ایک ادا کے

یہ تشنگیٔ فن ہے کہ بیچار گئی شوق
سو بار مٹا دی تری تصویر بنا کے

پھر کیوں ہے گُل و خار میں تفریق منور
پروردہ ہیں دونوں ہی اگر ایک فضا کے

۱۹۶۱ء

ترے ہی غم سے زمانے کا غم ہوا محسوس
تجھی سے دور تری راہ لے گئی ہے مجھے

○

شاعری میں وہ رنگ بھر جاؤں
ذات کو کائنات کر جاؤں!

بن کے میں مہرِ نیمروز اے کاش
دلِ ہر ذرّہ میں اُتر جاؤں!

سیکڑوں راستے ہیں پیشِ نظر!
سوچتا ہوں کدھر کدھر جاؤں

حاصلِ فن ہو گر بقائے دوام
کل کا مرتا میں آج مر جاؤں

روشنی راہ میں اِدھر نہ اُدھر!
میں اِدھر جاؤں یا اُدھر جاؤں

۱۹۶۰ء

○

موجۂ درد تو لایا سرِ گرداب مجھے
چھوڑ جانا نہ کہیں قوّتِ اعصاب مجھے

کیا ضروری ہے غمِ عشق کو معیار بھی دے
چشمِ پُرآب تجھے، دیدۂ بے خواب مجھے

تو وہ کہسار کہ ہے اپنی انا میں سرمست
میں وہ تنکا ہوں کہ درپیش ہے سیلاب مجھے

ان کے معیار کا جھنجٹ تو ہمیشہ رہتا
خیر گذری کہ نہ سمجھے ترے احباب مجھے

اپنے دیہات میں اب اپنا گذارا مشکل
اور ترے شہر کے آتے نہیں آداب مجھے

۱۹۶۹ء

○

بے صدا ہو گیا ہے نگر، سو رہو
جاؤ تم بھی میاں اپنے گھر، سو رہو

صبح ہوتے ہی تیشہ چلانا ہے پھر
تم نہ جاگا کرو رات بھر، سو رہو

کون دیکھے گا، پرکھے گا اس دور میں
تم لٹاؤ گے کب تک گہر، سو رہو

تو گرفتار ہو، صبر سے کام لو
رتجگوں کو تو ہے عمر بھر، سو رہو

دشتِ شب میں اکیلا ہی کر لوں گا طے
تم نہ جاگو مرے ہمسفر، سو رہو

۶۱۹۶۹

رشتۂ دل کو دیر پا رکھنا!
اس تعلق میں فاصلہ رکھنا

سارا عالم ہوا ہے تنگ نظر
دوستو! تم تو دل بڑا رکھنا

آگے بڑھنے کے حوصلے کے ساتھ
واپسی کا بھی راستا رکھنا

زندگی کے بڑے تقاضے ہیں
خود کو ہر رنگ آشنا رکھنا

شہر کو اپنا جاننا لیکن!
زخمِ آوارگی ہرا رکھنا!!!

بے وفا سب نہ سب ہیں اہلِ وفا
یہ تأثر مِلا جُلا رکھنا!!

نہیں دشوار جاننا اس کا!
ہاں نظر میں ادا ادا رکھنا!

۱۹۷۱ء

کس لئے رات کرتے ہو کالی میاں
فن برائی ہے اور علم گالی میاں

دیکھتے ہیں تماشے یہی روز و شب
ذہن شاداب ہے پیٹ خالی میاں

○

جو بات دل میں تھی کاغذ پہ کب وہ آئی ہے
کہ اب قلم میں تو مانگے کی روشنائی ہے

یہی نہیں کہ دھواں چبھ رہا ہے آنکھوں میں
کنواں بھی سامنے ہے اور عقب میں کھائی ہے

میں اپنے جسم کے دھبّے چھپائے پھرتا ہوں
مرے لباس سے مہنگی مری دُھلائی ہے

جو تیرے قرب میں گذری نہ تیری فرقت میں
وہ عمر ہم نے نجانے کہاں گنوائی ہے

صَدف ہیں یا کہ گہر، جھاگ ہیں کہ ریت فقط
ہمارے واسطے کیا لے کے موج آئی ہے

۱۹۷۴ء

○

○

مجھ سا کب شہر گرد تھا پہلے
جو تھا صحرا نورد تھا پہلے!

اتنی ہنگامہ خیز کب تھی حیات
اتنا تنہا نہ فرد تھا پہلے

برفباری تو ہوتی رہتی ہے
سرد ہوں میں نہ سرد تھا پہلے

اس قدر تو نہ پھول اے سرسوں
سبز موسم بھی زرد تھا پہلے

جس کو دیکھا وہ کہہ رہا تھا غزل
معتبر کب یہ درد تھا پہلے!

۱۹۷۶ء

○

نہیں معلوم کن خوش فہمیوں میں
رہے مست اپنی خستہ حالیوں میں

نظر پہنچی نہیں جن تک کسی کی
وہ پھل سوکھے ہوتے ہیں ڈالیوں میں

بہت ہے نیک نامی میں بھی لذّت
مزا کچھ اور ہے رسوائیوں میں

تمہاری یاد اور یہ سرد راتیں
غضب کی آنچ ہے تنہائیوں میں

غرض مندی سے اپنی ڈر رہا ہوں
کوئی مخلص نہ نکلے ساتھیوں میں

ذرا سی دیر سوئے تھے منّور!
کٹی پھر عمر شب بیداریوں میں

۱۹۶۵ء

○

دامِ بہارِ تازہ میں پھر لوگ آئیں گے
جو مسکرا رہے تھے، وہی مسکرائیں گے

اپنی حقیقتوں کی درختوں کو ہے خبر
کانٹے کہاں چبھیں گے کہاں پھول آئیں گے

ساکن ہوں شہر میں کہ بیاباں میں ہوں رواں
لوگ اپنی وحشتوں سے کہاں بچ کے جائیں گے

ہم تو نئے چراغ جلانے کے ساتھ ساتھ
جو دیپ بجھ گئے ہیں انہیں بھی جلائیں گے

مجھ پر نہیں ہیں ختم روایاتِ عاشقی
جو میرے بعد آئیں گے آگے بڑھائیں گے

۱۹۷۷ء

○

ذکرِ منزل نہ فکرِ راہگذر
رہ گیا ہے سفر برائے سفر

سر جھکانے کی عظمتیں معلوم
اب چمن میں وہ شاخ ہے نہ ثمر

کیوں توقع کرو زیادہ کی
در و دیوار ہی کو سمجھو گھر!

ایک ناؤ ہے وہ بھی کاغذ کی
اور مقابل میں ہیں ہزار بھنور

لمحہ لمحہ ہوا ہے دامن گیر
اور کر اہتمامِ شام و سحر!

زغن و زاغ کی لڑائی میں
عندلیبِ چمن اِدھر نہ اُدھر

۱۹۷۷ء

○

نئی فضا میں رہے ہم نئے سفر میں رہے
یہ اور بات کہ اپنے ہی بال و پر میں رہے

ہوا تھی اپنی مخالف کہ تیرگی تھی حریف
چراغ بن کے جلے اور رہگذر میں رہے

مذاقِ دربدری ہر قدم کے ساتھ رہا
سفر میں جب نہ رہے خواہشِ سفر میں رہے

مخالفت میں کسی کی جو تیرے ساتھ ہوئے
یہ مت سمجھ کہ ترے حلقۂ اثر میں رہے

تماشا دیکھنے بھی لوگ آ ہی جاتے ہیں!
سڑک پہ خلقِ خدا ہو تو کون گھر میں رہے

۶۱۹۷۲

○

موسموں کا نہ اعتبار رہا
گل تھا گل اور خار خار رہا

آئے اطراف سے کئی پتھر
جب تلک پیڑ پُر بہار رہا

شام تک اپنے منتظر تھے ہم
صبح تک تیرا انتظار رہا

میں تھا خاموش کوہ کے مانند
میری آنکھوں میں آبشار رہا

اپنے شعروں میں بھی زیادہ تر
اس کے غمزوں کا اشتہار رہا

اگست ۱۹۷۸ء

○

درد جب شعر میں ڈھل جاتے ہیں
لفظ، مفہوم بدل جاتے ہیں

گھر میں آتے ہیں بہت رات گئے
مونہہ اندھیرے ہی نکل جاتے ہیں

سب کو احساس کہاں ہے کہ سبھی
کچھ نہ کچھ روز بدل جاتے ہیں

وہی دریا ہیں کہ جن کے رستے
بحر کی سمت نکل جاتے ہیں

صرف صحرا ہی پہ الزام ہے کیوں
پھول گلشن میں بھی جل جاتے ہیں

لوگ چلتے ہیں منوّر کس سمت
اور کس سمت نکل جاتے ہیں

۱۹۷۷ء

○

جانے کیوں قیدِ ماہ و سال میں ہے
جو ستارہ بھی ہے زوال میں ہے

سادہ کاغذ ہے سامنے کب سے
ایک عالم مگر خیال میں ہے

شورِ فریاد و شورشِ بیداد
شہر یہ مستقل وبال میں ہے

مجھ میں روشن ہے میرا آئندہ
میرا ماضی بھی میرے حال میں ہے

کہر آلود کچھ ہے منظر بھی!!
کچھ نظر بھی خود اپنے جال میں ہے

تجھ سا خود سر کہ مجھ سا آشفتہ
روز کب کوئی ایک حال میں ہے

جنوری ۱۹۷۸ء

○

دیواروں میں در رکھتے ہیں
روشن ہر منظر رکھتے ہیں

سیج سجاتے ہیں پھولوں کی
کانٹوں کا بستر رکھتے ہیں

اپنے اندر سو ہنگامے
گم صم بام و در رکھتے ہیں

دیواریں ہیں قدم قدم پر
جس بستی میں گھر رکھتے ہیں

کچھ بھی ہوں چیزوں کی شکلیں
ہم بھی ایک نظر رکھتے ہیں

گرمی سردی کا اندازہ
بے گھر ہی بہتر رکھتے ہیں

اپنی خاک میں ہم بھی کیا کیا
پتّے پھول شجر رکھتے ہیں

اگست ۱۹۷۸ء

بحر آنچ دیتا ہے، چاندنی ڈبوتی ہے
خواب دیکھنے کی بھی خاص عمر ہوتی ہے

○

بجد سے حبس کو بھی گذارنا ہے
سنگ دیوانے ہی کو مارنا ہے

گھر میں دفتر میں بزم یاراں میں
ہر جگہ اور روپ دھارنا ہے

گھولنی ہے فضا میں شیرینی!
زہر کو روح میں اتارنا ہے

دھن یہی ہے کہ ایک شعلۂ رنگ
اپنی ہی خاک سے ابھارنا ہے

جیسے ہم زندگی گذارتے ہیں
کیا یہی زندگی گذارنا ہے

پھر سے ترتیب دے کے چیزوں کو
ایک منظر نیا ابھارنا ہے

اگست ۱۹۷۸ء

دامنِ شب میں ستارے چمکے
ناامیدی میں سہارے چمکے

جو کبھی باعثِ رسوائی تھے
اب وہی داغ ہمارے چمکے

ایک خورشید ڈھلا سینے میں
سرِ مژگاں کئی تارے چمکے

بحر کس شان سے پایاب ہوا
ہم جو ڈوبے تو کنارے چمکے

مہر ابھرا تو سبھی روشن تھے
کونسے آپ ہی نیارے چمکے

عاشقی، دربدری، نغمہ گری!
ہم سے یہ سارے ادارے چمکے

۱۹۷۴ء

○

چہرۂ شب بڑا ہی کالا ہے
کوئی سورج نکلنے والا ہے

مجھ سے بچپن میں لوگ کہتے تھے
تو بڑا ہی نصیب والا ہے

تیری نسبت سے ہے وجود مرا
ذکر تیرا، مرا حوالا ہے

قلزمِ بیکراں سے شکوہ کیا
ڈول ہی جب کنویں میں ڈالا ہے

اس قدر آ گیا ہے کیوں نزدیک
تو بھی کیا چھوڑ جانے والا ہے

لوگ ایسے بجھا رہے ہیں چراغ
جیسے اب دائمی اجالا ہے

۱۹۷۷ء

○

حسنِ یوسف کا خریدار رہا
شہر کا شہر ہی بازار رہا!

اب ہواؤں کے نصیبے جاگے
بوئے گل بر سرِ پیکار رہا

موج سے موج نکلتے دیکھی
رنگ سے رنگ نمودار رہا

لاش رستے میں پڑی ہے تنہا
حادثہ تو سرِ بازار رہا

چشمِ نظارہ سرِ راہ رہی
جانے کیا کیا پسِ دیوار رہا

چاند کی نوک چبھی ہے دل میں
عید ہی کیا کوئی تہوار رہا!

اگست ۱۹۷۸ء

○

کئی مراحل ہیں اک قدم کے
عذاب میں ہے غزال رَم کے

صنم سے بھی شوخ تر رہے ہیں
یہ پاسباں کوچۂ صنم کے

گلی کے منظر بجھے ہوتے ہوں
تو اس جھروکے میں چاند چمکے

یہ کربِ ذاتی ہے کائناتی
نکھر گئے رنگ چشمِ نم کے

وہی مرا دل ہے آفتِ جاں
وہی ہیں دکھڑے جنم جنم کے

اگست ۱۹۷۸ء

○

اہلِ جنوں کا جنوں سلامت، ذوقِ تماشا عام بہت
گلی گلی دروازے روشن، پُر رونق ہیں بام بہت

راہِ جدائی دونوں ہی نے مرضی سے اپنائی تھی
پھر اب کیوں بے چین ہوں میں اور وہ ہے بے آرام بہت

تعزیروں کا چرچا ہو تو نگر نگر ہم رسوا ہیں!
رسوائی اعزاز بنے تو ہم ٹھہریں گمنام بہت

کچھ پر نام تھے اوروں کے اور کچھ میں خون کی لہریں تھیں
تشنہ لبی کی خیر منائی اور ٹھکرائے جام بہت

اس کے ہجر میں یوں جیتے تھے جیسے کوئی کام نہ تھا
آج اسے پایا تو منوّر یاد آئے ہیں کام بہت

۲ مارچ، ۱۹۷۸ء

○

تیر کب کوئی بے نشانہ ہے
شعر گوئی تو اک بہانہ ہے

ایک میری ہی داستان نہیں
اکثریت کا یہ فسانہ ہے

صرف میرا نہیں، جوانی ہیں
سب کا انداز باغیانہ ہے

ہر فضا سے بلند اور فضا!
طائروں کا بھی کیا ٹھکانہ ہے

لوگ اس شہر میں بکھر سے گئے
کئی ٹکڑوں میں اک گھرانہ ہے

خاک کی خود تو کچھ نہیں قیمت
پر اسی خاک میں خزانہ ہے

۱۹۷۵ء

فردیات

روشنی سے جو پلٹنا چاہا! سامنے اپنا ہی سایا دیکھا!

نظر گہرائیوں میں جھانکتی ہے ہر اک دیکھی ہوئی شے بھی نئی ہے

ترے سلوک نے بخشا شعورِ زیست ہمیں وگرنہ اتنے زمانہ شناس ہم بھی نہ تھے

تہمت کوئی ستم کی نہ افلاک پر لگے بربادیوں کو اپنی ہے خود آدمی بہت

پانی کی بھی رنگتیں وہی ہیں جو رنگ ترے گلاس میں ہیں

کبھی برپا تھا جو سینے میں میرے وہی کہرام اب گھر گھر ہے یارو

جو کچھ بھی فضا ہے مگر اے بادِ صبا دیکھ یہ بات گلستاں کی ہے باہر تو نہ جائے

یہ کیسا دشت جدائی پڑا سرِ منزل اگرچہ عہدِ سفر میں قریب تھے دونوں

صلہ ملا مجھے ذوقِ خلانشینی کا
قدم قدم پہ ہے احساس بے زمینی کا

⊙

بادِ باراں کے ناز اٹھاتی ہے
گرد اُٹھتی ہے، بیٹھ جاتی ہے

⊙

ہر تعلق میں نہ لا گردشِ زر کی رسمیں
مختلف کچھ تو ہوں بازار سے گھر کی رسمیں

⊙

کہاں کی خود داریاں منوّر
ذلیل ہونے سے بچ رہا ہوں!

⊙

عجیب رنگ ترے اہلِ غم پہ طاری ہے
دل و دماغ میں اک سرد جنگ جاری ہے

⊙

اس سے مل کر خوشی ہوئی کیا کیا
جیسے اب کوئی مسئلہ ہی نہیں

⊙

صبح کا نام لے کے لوگوں نے
جانے کتنے دیئے بجھائے ہیں

⊙

کلی کلی ہے کھلے گلستاں کہ صحرا ہیں
نمو کا حق تو علاقے سے یا نسب سے نہیں

⊙

خود جل رہے ہیں تاکہ زمانے میں چھاؤں ہو
صحراؤں میں درخت کی صورت کھڑے ہیں ہم

⊙

نقشِ کہن بہت سے ہم نے مٹا دیئے ہیں
تصویر پھاڑ دی ہے اور خط جلا دیئے ہیں

⊙

رات ہے بے نور دن بے رنگ ہے
زندگی یکسانیت سے تنگ ہے

⊙

روشنی تو کوئی نہ دیکھ سکا
سب نے سمجھا دیا ہے مٹی کا

کہیں روشن نہیں ہیں راتیں بھی!　　کہیں دن میں چراغ جلتے ہیں

کلیاں سدا اُٹھی ہیں نسیمِ سحر کے ہاتھ　　اک اجنبی سے کیجیو پیمان دیکھ کر!!

سامنے جب مرے منزل آئی　　بڑھ گیا اور تھکن کا احساس

اس کو پانے کی تمنا ہے بڑی چیز مگر　　دوستو صرف تمنا سے بھی کیا ہوتا ہے

رکا تو بند ہوئی راہِ عام بھی مجھ پر　　چلا تو کتنے ہی رستے نئے نئے نکلے

عمدہ پوشاکوں میں جسم ہیں یوں جیسے　　مرجھائے سے پھول حسیں گلدانوں میں

دریائے زندگی میں روانی اسی سے تھی　　اک موج دوسری میں سماتی چلی گئی!

یہ بھی اعزاز کوئی کم تو نہیں ہے یارو　　لوگ ہر شخص کو گالی بھی کہاں دیتے ہیں

شبِ سیاہ کی تردید کی ضرورت ہے　　کبھی قمر کبھی خورشید کی ضرورت ہے

مجھے کچھ سوچ کر بیدار کرنا　　کہ میں سویا ہوا آتش فشاں ہوں

اک ایسے دشت میں ہوں میں کہ مس یاد دلا　　بسنت رت کی کنواری پھوار ایسا ہے

ہر شخص کی ہنگامۂ ساحل پہ نظر ہے　　اور اپنی سمندر کے ساحل پہ نظر ہے

شریف منور اس عذاب زدہ نسل کے فرد ہیں جو آخری "ہاں" اور فیصلہ کن "نہیں" کے درمیان جان کنی کی زندگی گذار رہی ہے جو کچھ بھی ہے وہ ایک کربناک عبثیت کے سوا اور کچھ نہیں۔ وجود کے شہر میں یقین کا قحط ہے اور اس قحط میں نئے یقین کی فصل اگانے کا شوقِ فزوں۔ یہ ہے اس نسل کی سرنوشت یا سرگذشت۔

اس نسلی گروہ کے کسی ہوشمند شاعر کی شاعری کسی طور پر بھی سلسلۂ ذات افزائی اور سررشتۂ سخن آرائی سے عبارت نہیں ہو سکتی۔ شریف منور کی شاعری نمایاں طور پر زندگی کی سنگین اور احساس انگیز معنویتوں اور محرومیوں کا سنجیدہ ترین معاملہ ہے۔

وہ آشوبناک مسائل کے اس دور اور اس زندگی آزار اور جمال بیزار معاشرے میں اپنے احساس و اظہار کی وابستگیوں اور علاقہ داریوں کے دائرے کا پورا اندازہ رکھتے ہیں۔ وہ معاشرے کے سچے شاعر ہیں اس لئے باہر کی ہر افتاد ان کے اپنے اندر کی افتاد ہے۔ میرے خیال میں ان کی غزل کا ایک خاص طور پر قابلِ ذکر پہلو یہ ہے کہ ان کی غزل، غزل کی موروثی ایمائیت سے کوئی کفالت نہیں چاہتی۔ غالباً یہ کوئی خوبی کی بات نہیں ہے مگر خوبی کی جو بات ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی غزل کے لئے ایک بدل تلاش کیا ہے اور وہ ہے احساس کے درجۂ قوت اور اظہار کے درجۂ قوت کے درمیان ایک ایسی مساوات جو شعر کو صحتمند تنفس کی طرح ایک حیاتی اور فطری مظہر بنا دیتی ہے۔ یہ غزل کی ایک ایسی شاعری ہے جو ہدایت ناموں اور مجرب نسخوں سے بے نیاز ہوتی ہے۔ شریف منور کی شاعری کا نمائندہ ترین حصہ، فکر کی احساس مندی اور جذبے کی پرشعوری کا قابلِ رشک مظہر ہے۔

جونؔ ایلیا